ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

خودنوشت 'منزلیں گرد کے مانند' کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study Of Autobiography, "Manzilen Gard Kay Manind"

***Dr. Khalid Mahmood**

(Lecturer) Department of Pakistan Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad

ABSTRACT:

Khalique Irahim Khalique is considered as the pioneer of Documentary Film Industry in Pakistan. However, he was also a unique writer, poet and drama writer. 'Manzilen Gard kay Manind' is the autobiography of Khalique Ibrahim Khalique. In this article, the researcher has analyzed the memories of this autobiography. It is a unique book regarding the memories of Khaliq as the he discussed himself a little bit in this book. He came in Pakistan in 1953 from India and worked for the production of documentary films. Pakistan Story and Ghalib are the most famous films produced by him. He was awarded almost 20 national and international awards. He discussed an elaborated history of various personalities in his memories.

Keywords: Documentary, Lucknow, Film Industry, Poet, India, Progressive.

تعارف:

ایسی باقاعدہ تصنیف، جس میں مصنف اپنی داستان حیات قلمبند کرتا ہے، اسے انگریزی میں Autobiography جبکہ اردو میں آپ بیتی یا خودنوشت سوانح حیات یا خودنوشت سوانح عمری کہتے ہیں۔

''دوسروں کی سوانح لکھنا یا دوسروں کے احوال و کوائف قلم بند کرنا بہت آسان کام ہے اس کے برعکس اپنی خود نوشت مرتب کرنا اور اپنی کتابِ زندگی کو بے کم و کاست تحریر کے قالب میں ڈھالنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے''۔ (۱)

ناول، افسانہ اور ڈرامہ کی طرح آپ بیتی یا خودنوِشت بھی ادب کی ایک باقاعدہ اور مقبول صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ اگرچہ خودنوشت سوانح عمری بنیادی طور پر لکھنے والے کی زندگی کے احوال و واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے تاہم وہ مجموعی طور پر زندگی کے بارے میں مصنّف کے نقطۂ نظر اور زاویۂ فکر کی عکّاسی بھی کرتی ہے۔ اردو ادب میں ایک اچھی خودنوشت کی خوبی ہوتی ہے کہ اس میں بغیر کسی مبالغہ آرائی کے سچائی بیان کی گئی ہو۔ دانستہ طور پر حقائق پر پردہ ڈالنے کی بجائے حقائق کو سامنے لایا گیا ہو، مزید یہ کہ مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر سچائی کو مہارت کے ساتھ بیان کر کے اسے دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ ادا کیا گیا ہو۔

''آپ بیتیاں دراصل وہ کھڑکیاں ہیں، جن کے دوسری طرف قاری کو اپنی ذات سے الگ حقیقی زندگیوں کا عکس نظر آتا ہے، ایک تجسس اور اشتیاق کی کھڑکی دوسری طرف موجود زندگی کے تمام راز، تجربات، محسوسات، مشاہدات، نظریات، رہن سہن، تہذیب و ثقافت سب کچھ جان لینا چاہتا ہے''۔ (۲)

اردو میں آپ بیتیوں کی ابتداء:

''تاریخ میں اولین خودنوشت سوانح عمری سینٹ آگسٹائن کی تھی، جو کہ آج سے سولہ سو برس پہلے تحریر کی گئی''۔(۳)

جہاں تک اردو ادب میں خودنوشت سوانح کا تعلّق ہے تو اس کی ابتداء کے بارے میں علم الدین سالک صاحب نے تحریر کیا ہے کہ:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

"ہمارے یہاں آپ بیتیوں کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد شروع ہوا۔ جس قدر ملک ترقّی کرتا گیا اسی قدر زیادہ آپ بیتیاں لکھی جاتی رہیں۔ چنانچہ سب سے پہلی آپ بیتی جو اردو زبان میں گئی وہ مولانا محمد جعفر کا 'کالاپانی' ہے۔ اس میں مولانا محمد جعفر تھانیسری نے اپنی زندگی کے اس دور کا پورا نقشہ کھینچا ہے جو انہیں جلاوطنی میں بسر کرنا پڑا"۔(۴)

اس کے برعکس ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ایک اور خودنوشت کی طرف اشارہ کیا ہے جسے 'بیتی کہانی' کے نام سے شہر بانو بیگم نے تحریر کیا تھا۔

"یہ بھی ایک تعجب خیز امر ہے کہ اس خاتون کی تعلیمی استعداد بہت معمولی اور واجبی تھی۔ مصنفہ نے اپنی خودنوشت میں (۱۸۴۸ء تا ۱۸۸۷ء) تقریباً چالیس سال کا احاطہ کیا ہے۔ زیرِ نظر 'بیتی کہانی' ریاست پاٹوڈی اور اس کے حکمرانوں کے بارے میں جو معلومات فراہم کرتی ہے وہ اس موضوع پر کسی مستقل مآخذ کی غیر موجودگی میں ایک بنیادی چشم دید اور راست مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے"۔(۵)

ایک اہم سوانح 'ذکرِ میر' ہے جسے خدائے سخن میر تقی میر سے نسبت ہے۔ گو زمانی لحاظ سے اس کا تذکرہ سب سے پہلے کیا جانا چاہیے تھا لیکن میر تقی میر نے یہ خودنوشت فارسی زبان میں لکھی تھی اور بعد ازاں اس کا اردو ترجمہ بھی ہوا۔ معروف مؤرخ خواجہ حسن نظامی کی خودنوشت 'آپ بیتی' کے نام سے ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی۔ جوش ملیح آبادی کی شہرۂ آفاق آپ بیتی 'یادوں کی برات' (۱۹۷۰ء) اور معروف بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت 'شہاب نامہ' سے شاید ہی کوئی ناواقف ہو۔ شاعر مزدور احسان دانش کی خودنوشت 'جہانِ دانش' ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ قتیل شفائی کی 'گھنگرو ٹوٹ گئے' جب کہ علامہ حسین احمد مدنی کی آپ بیتی 'نقشِ حیات' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ معروف بھارتی صحافی خشونت سنگھ نے اپنی آپ بیتی انگریزی زبان میں تحریر کی جو بعد ازاں 'سچ، محبت اور ذرا سا کینہ' کے عنوان سے اردو میں شائع ہوئی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہتمم سعید الرحمن اعظمی ندوی نے '۴۸ سال شفقتوں کے سائے میں' قلمبند کی۔ ان مندرجہ بالا آپ بیتیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی اہم اور قابل ذکر خودنوشتیں تحریر کی گئی ہیں جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کی 'تذکرہ'، قراۃ العین حیدر کی 'کارِ جہاں دراز ہے'، جگن ناتھ آزاد کی 'میرے شب و روز' طارق محمود کی 'دامِ خیال' اور امرتا پریتم کی آپ بیتی 'رسیدی ٹکٹ' شامل ہیں۔ نیلام گھر کے مشہور میزبان طارق عزیز نے اپنی آپ بیتی 'فٹ پاتھ سے پارلیمنٹ تک' تحریر کی جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔

منزلیں گرد کے مانند کا مختصر تجزیہ

'منزلیں گرد کے مانند' خلیق ابراہیم خلیق (۲۰۰۶ء-۱۹۲۶ء) کی زندگی کے ستائیس سالہ حالات کی کہانی ہے۔ اس خودنوشت کا عنوان فراق گورکھپوری کے شعر سے اخذ کیا گیا ہے:

"منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں

وہی انداز جہان گزراں ہے کہ جو تھا"

خود خلیق کے بقول:

"یہ خودنوشت دوسری خودنوشتوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہ آپ بیتی سے زیادہ ایک تہذیب کی سرگزشت ہے"۔

خلیق ابراہیم خلیق نے فروری ۱۹۲۶ء میں حیدرآباد دکن میں جنم لیا، جہاں ان کے والد حکیم محمد رفیق ابراہیم ایک مطب چلاتے تھے، بعد ازاں آپ کا خاندان اپنے آبائی شہر لکھنؤ آبسا اور یہیں پر خلیق ابراہیم خلیق نے اپنی تعلیم حاصل کی۔ خلیق کے والد اور دادا نے تحریک پاکستان کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ خلیق کی ادبی زندگی ۶ دہائیوں پر محیط ہے، وہ ۱۹۴۰ء میں بحیثیت شاعر اور ادیب سامنے آئے۔ پنجاب یونیوسٹی سے گریجویشن کے بعد انڈیا میں اطلاعاتِ فلم کے شعبے میں بمبئی سے اپنی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں ۱۹۵۳ء میں آپ پاکستان آئے اور شعبۂ فلم و اطلاعات میں ۲۵ برس تک منسلک رہے۔ خلیق ابراہیم خلیق پاکستان میں ڈاکیومنٹری فلم کے بانی تصور کیے جاتے ہیں اور ان کو متعدد قومی و بین الاقوامی ایوارڈز سے نوازا گیا۔(۶) ان کی مشہور فلموں میں 'پاکستان کہانی' اور 'غالب' شامل ہیں۔ شاعری کے حوالے سے مجموعہ 'تین طویل نظمیں' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ انہوں نے ایک خودنوشت بھی تحریر کی جو 'منزلیں گرد کے مانند' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ۲۹ ستمبر ۲۰۰۶ء کو کراچی میں وفات پائی اور سخی حسن کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔(۷)

خلیق ابراہیم خلیق کے وفات پر زاہدہ حنا خلیق ابراہیم خلیق کی آپ بیتی کو زیر بحث لاتے ہوئے انہیں اس طرح خراج تحسین پیش کرتی ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

"اس کتاب میں تقسیم سے پہلے اور فوراً بعد کا وہ سماج نظر آتا ہے جس میں مذہب اور مسلک ذاتی معاملات تھے جہاں بنارس ہندو یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کے شعبے کے سربراہ مولوی مہیش پرشاد تھے، مولوی کا لاحقہ ان کے نام کے ساتھ اس لیے لگا ہوا تھا کہ وہ مولوی فاضل کے امتحان میں اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ ان ہی صفحوں پر ریٹائرڈ جسٹس ٹی ایس کو چک سے ملاقات ہوتی ہے جو سنسکرت کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور عربی پر دسترس رکھتے تھے۔ صبح دم گیتا کے پاٹھ کے ساتھ ہی تلاوت کلام پاک بھی کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ میرا نام تیج شنکر کو چک بھی ہے اور تصدق شہیدین کو چک بھی۔ ان کا ذکر خلیق بھائی نے اس طرح کیا ہے کہ ہر لفظ سے شہد ٹپکتا ہے"۔(۸)

خلیق ابراہیم نے اپنی خود نوشت میں ان ادیبوں کا ذکر بھی کیا ہے جو ترقی پسند تحریک کے اہم ستون سمجھے جاتے ہیں، شعوری اور لاشعوری اعتبار سے جوش ملیح آبادی، سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری سے بہت متاثر تھے۔ پہلی بار ۱۹۳۹ء میں مجاز سے ملاقات ہوئی تو ان کے گرویدہ ہو گئے، اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"ان سے اپنے نیاز مندانہ تعلقات کے دوران مجھے انہیں قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے اور میں نے ان کی قلبی واردات اور ذہنی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کی زندگی اور شاعری کے اس مطالعے میں کچھ ایسی باتیں ملیں جو ایک شخص اور شاعری کی حیثیت سے ان کے مقام کے تعین میں خاصی اہمیت رکھتی ہیں"۔(۹)

عام طور پر خود نوشت نگار اپنی ذات پر پردے ڈالتے ہیں تاکہ وہ حقائق کو ایسی صورت میں سامنے لائیں جس طرح کہ ان کی شخصیت ہے۔ اپنی ذات کو کائنات کا مرکز سمجھ کر خود پرستی کی انتہاؤں تک پہنچ جاتے ہیں اور افسانہ وافسوں کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح آپ بیتی گزرے ہوئے واقعات کی نہیں، خواہشوں، تمنّاؤں اور حسرتوں کی رُوداد بن جاتی ہے۔ اس صورتحال کی وجہ یہ ہے کہ خود نوشت نگار اس خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ جس موضوع پر لکھ رہے ہیں، اس کا ماخذ چوں کہ ان کی اپنی ذات ہے، اس لیے انہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ جو چاہیں اور جس طرح چاہیں لکھیں، لیکن ایک ذمّہ دار خود نوشت نگار اس ناجائز حق کو استعمال نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے، آپ بیتی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر نہیں لکھی جاتی کہ صرف اپنا ہی چہرہ نظر آئے۔ اپنے گرد و پیش پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جس معاشرے سے وہ وابستہ ہے اسے نظر انداز کر کے وہ اپنے آپ سے بھی انصاف نہیں کر سکتا۔ پوری شخصیت آئینے میں نہیں معاشرے کے چوکھٹے میں اجاگر ہوتی ہے۔ ایک اچھی آپ بیتی صرف ذات کی ترجمان نہیں ہوتی، اس معاشرے کی بھی عکّاس ہوتی ہے جو فرد کی ذات کی تشکیل و تعمیر کرتا ہے۔ اس اعتبار سے خلیق ابراہیم خلیق کی زیرِ نظر آپ بیتی ایک مثالی آپ بیتی ہے۔ یہ ایک فرد کی داستانِ حیات ہی نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی معاشرتی، سیاسی، علمی اور ادبی تاریخ بھی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیق صاحب نے ایک بھرپور زندگی بسر کی ہے۔ انہوں نے ایک ایسے زمانے میں ہوش سنبھالا جب برِّصغیر کی تاریخ میں جہانِ نو پیدا ہو رہا تھا۔ انہیں اپنے عہد کی سیاسی و ادبی تحریکوں کو بہت قریب سے دیکھنے ہی کا موقع نہیں ملا، ان میں شرکت کا بھی اتّفاق ہوا۔ بے شمار سیاسی، مذہبی اور علمی و ادبی شخصیتوں اور فن کاروں کو جاننے پہچاننے کے مواقع ملے، تاریخ کو بنتے اور جغرافیہ کو بگڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آزادی سے پہلے کے جمے جمائے معاشرے کی متعیّن اقدار کے تحت زندگی بسر کی اور پھر ان اقدار کی شکست و ریخت کا منظر بھی دیکھا۔ ان سب تجربات و مشاہدات کو انہوں نے اس خوب صورتی سے اور ایسے دلکش پیرایۂ بیاں میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے کہ یہ آپ بیتی ایک منفرد ادبی کارنامہ بن گئی ہے۔

خلیق ابراہیم خلیق یکم فروری ۱۹۲۶ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ پیشے کے اعتبار سے فلم ساز تھے لیکن شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ بنیادی طور پر ترقی پسند فکر سے تعلق رکھتے تھے اور آخری وقت میں بھی اس فکر سے جڑے رہے۔ یہ کتاب ان کی ساری زندگی کا نچوڑ ہے۔ تہذیبی، سیاسی امور اور شخصیات سے متعلق اس کتاب میں حیرت انگیز انکشافات ہیں۔ اپنے خاندان کو مرکزِ ثقل بنا کر، اہم ادبی شخصیات کا ذکر کرتے چلے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ پاکستان آ گئے۔ کچھ عرصہ فری لانس صحافی رہنے کے بعد حکومتِ پاکستان کے محکمۂ فلم و مطبوعات سے وابستہ ہوئے جبکہ ادبی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ 'اجالوں کے خواب' اور افسانوں کا مجموعہ 'کامیاب ناکام' جب کہ ڈرامہ 'عورت، مرد اور دنیا' ان کی نمایاں علمی و ادبی خدمات ہیں۔

ان کی خود نوشت 'منزلیں گرد کے مانند' دوسری خود نوشتوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہ آپ بیتی سے زیادہ ایک تہذیب کی سرگزشت ہے۔ اردو میں گزشتہ جتنی بھی آپ بیتیاں لکھی گئیں ہیں ان میں اکثر تاریخی حقائق ہمیں مل جاتے ہیں۔ لیکن خلیق صاحب کی اس خود نوشت میں برِصغیر کی تاریخ کا ایک اہم ترین دور اپنی تمام تر ہنگامہ پروری کے ساتھ رخشاں وجولاں نظر آتا ہے۔ سب سے بڑھ کر انہوں نے لکھنؤ کا ذکر کیا ہے کیونکہ یہ خود بھی لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنؤ برِصغیر کا وہ ثقافتی مرکز تھا جہاں قدیم و جدید کی آویزش اور پیکار سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ کٹّر قدامت پرستی عالمِ نزع میں تھی اور قدیم و جدید کی اصل پیکار روایت پسندوں اور حقیقت پسندوں کے درمیان تھی۔ عمومی صورتحال بیان کرتے ہوئے انہوں نے ۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۶ء تک کے لکھنؤ کے حالات بیان کیے ہیں۔ قدیم و جدید کی لڑائی اصلاحِ معاشرہ، مذہب، سیاست، ثقافت، سبھی میدانوں بہت نمایاں تھی۔ خلیق ابراہیم خلیق نے ان تمام تاریخی پہلوؤں پر نظر رکھی ہے۔ اس دور کے لکھنؤ میں پردہ صرف شرفاء کی خواتین کرتی تھیں اور شرفاء میں امراء و رؤساء کے لوگ شامل تھے۔ ان شریف خواتین کا پردہ بھی صرف شرفاء سے رہ گیا تھا۔

مذہبی صورتحال بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ لکھنؤ میں شیعہ تعلیمات دی جارہی تھیں جس کے باعث لکھنؤ میں مختلف متحرک گروہ بن گئے جو اپنی اپنی تعلیمات کی تبلیغ کرنے لگے اس طرح لکھنؤ فسادات کا گڑھ بن گیا۔ یہاں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ ان کہ دادا پر دادا نے ان فسادات کو ختم کرنے میں حصّہ لیا۔ بہت سے لوگ نیاز و نگار کے خلاف ہوگئے اور اس کو قانوناً بند کرانے کی عملی تحریک بھی چلائی گئی لیکن قدامت پرست ان کی ذات کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکے اور نا ہی نگار کو بند کرا سکے۔ خلیق نے قدیم علوم کی بازیافت بیان کرتے ہوئے اس دور کے طب کو بیان کیا ہے۔ سیاسی صورتحال تقریباً وہی ہے جو ہمیں ہر جگہ سے مل جاتی ہے۔ ثقافتی صورتحال انہوں نے ایک ناقد کی حیثیت سے بیان کی ہے۔ مصوّری، موسیقی، رقص، اردو ڈرامہ اور تھیٹر کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے مصوّری کے حوالے سے سید حسن عسکری کا ذکر بہت خوب کیا ہے۔ اس دور کی خطاطی کو بھی زیر بحث لایا ہے جس سے اس دور کی ثقافت کا عکس ظاہر ہوتا ہے۔(۱۰)

خلیق نے لکھنؤ کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی سرسید احمد خان کے مخالفین اور حامی موجود تھے۔ اسی عرصے میں جسٹس کرامت حسین نے ہمت کرتے ہوئے مسلم گرلز اسکول قائم کیا جسے بعد ازاں کالج کا درجہ حاصل ہوا۔ تعلیم کے حوالے سے آپ وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تعلیم نسواں کی تحریک انیسویں صدی کے اواخر سے، مخالفتوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے، ۱۹۳۶ء تک آتے آتے خاصی کامیابی حاصل کر چکی تھی۔ لکھنؤ اور سارے برصغیر میں لڑکیوں کے لیے متعدد اسکول اور کالج کھل چکے تھے اور بعض اور یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم بھی شروع ہو چکی تھی۔ اب تعلیم نسواں کی تحریک کی جگہ آزادیٔ نسواں کی تحریک لے رہی تھی"۔ (۱۱)

علم و ادب کی کیا صورتحال تھی وہ ہمیں ان کی آپ بیتی میں واضح نظر آتی ہے۔ دیومالائی قصوں اور خیالی داستانوں سے حقائق حیات پر مبنی ناولوں اور افسانوں تک کے سفر کا ذکر ہے۔ خلیق نے جدید شاعری سے جدید غزل، مرثیہ، گیت کی اصناف کا ذکر بھی بخوبی کیا اور اس کے بعد اس دور کی ظریفانہ شاعری کے ضمن میں ظریف لکھنوی کا ذکر کیا ہے۔ نثر میں ظرافت کے حوالے سے 'اودھ پنچ' کے کردار کو اجاگر کیا جبکہ ترقی پسند ادب کی تحریک کا پس منظر اور آغاز بیان کیا ہے۔

خلیق ابراہیم خلیق کی سوانح عمری پر بحث کرتے ہوئے رفیعہ سرفراز رقمطراز ہیں:

"لکھنؤ میں چونکہ عیش پرستی اور رنگین مزاجی عام تھی۔ اس لیے وہاں مذہب سے دوری ایک اہم محرک کی وجہ یہی باتیں تھیں۔ اگرچہ محرم کے ابتدائی دس ایام میں کافی زیادہ مذہبی جوش سے کام لیا جاتا تھا۔ یہاں اس آپ بیتی میں لکھنؤ میں مذہبی صورت حال پہ بھی بحث کی گئی ہے۔ جس کے مکالمے سے اس بات کی واقعی طور پر تصدیق ہو جاتی ہے کہ لوگ اپنے مذہب سے کس قدر دور تھے"۔(۱۲)

اس سیاسی منظر نامے کے بعد لکھنؤ کے اس دور کے حالات بیان کیے ہیں جب وہ لڑکپن سے جوانی کے دور میں قدم رکھ رہے تھے۔ خلیق ابراہیم خلیق جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ اس دور کی شخصیتوں میں انہوں نے حکیم عبدالقوی، حکیم محمد رفیق ابراہیم، حکیم محمد بشیر ابراہیم مخمور کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے گھرانے کے چند ہندو احباب بھی تھے۔ ان کے تہوار میں یہ لوگ شمولیت اختیار کرتے اور وہ لوگ ان کے عید بقر عید میں آکر کھانا کھاتے۔ اس کے علاوہ میرزا یگانہ، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور ان کے قریبی پڑوسی تھے۔ چنانچہ اس طرح ان کی ملاقاتیں ان ادبی شخصیتوں سے ہوتی رہیں اور ان کے حالات زندگی کا انہوں نے بخوبی ذکر کیا ہے۔ یوں بھی نوجوانی میں ان کے شناساؤں کا حلقہ خاصہ وسیع تھا جن میں کم عمر سے لے کر بڑی عمر کے احباب بھی شامل تھے۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۳ء تک کے مختلف اوقات کے دوران لکھنؤ میں جن احباب سے ان کا خاصہ ربط تھا ان میں مجاز، احتشام حسین، احسن فاروقی کے نام شامل ہیں۔ بمبئی کے احباب میں جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، صفدر میر اور اختر الایمان شامل ہیں۔ سید یوسف علی ان کے ہم جماعت تھے جن کے ساتھ انہوں نے اپنا لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے بیتائے۔ ان کے حلقے کے زیادہ تر افراد شعر و ادب سے تعلق رکھتے تھے۔ شوکت صدیقی اور علی مظہر رضوی سے قریبی دوستی تھی۔ انہوں نے اپنے اس دور کی تمام شخصیات و احباب کے بارے میں مختصر اً تعارف دیا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے خلیق ابراہیم خلیق نے اپنی زندگی کو بھی کسی فلم کی طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بسا اوقات ایسے تاریخی واقعات خود نوشت کو بوجھل بنا دیتے ہیں جن کا ذکر ہمیں دیگر تاریخی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ جیسے عشرۂ ما قبل آزادی کے سیاسی حالات میں انہوں نے انہی حالات کا ذکر کیا ہے۔ البتہ ثقافتی حالات سے وہ کس طرح واقف ہوئے اس کا ذکر بہت خوب ہے۔ اس کے بعد جھوائی ٹولے کے آس پاس کے علاقوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد لکھنؤ کی رونق کی باعث جو شخصیتیں تھیں ان کا ذکر کیا ہے جن میں جوش ملیح آبادی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، علی سردار جعفری، سبطِ حسن، مجاز، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، حیات اللہ انصاری، احتشام حسین اور ممتاز حسین نمایاں ہیں۔(۱۳)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

مجاز کا جو خاکہ انہوں نے پیش کیا ہے وہ قابلِ ذکر ہے، مجاز کے حوالے سے جو معلومات ہمیں ان کی اس سرگزشت میں ملتی ہے وہ اور کہیں نہیں ملتیں۔ ان کی زندگی کے حالات کا بڑا جامع و اختصار کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ اس کے بعد ان کی نظموں اور غزلوں کا تجزیہ پیش کیا ہے، 'رات اور ریل' کی وقعت، معنی آفرینی کو اپنی بصیرت سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور دہلی کے حالات کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد تفصیلاً ان کی علمی و ادبی خدمات کو اجاگر کیا ہے۔

'کچھ اور ادبی شخصیتیں' کے نام سے ایک اور باب علمی و ادبی شخصیتوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ جن میں عبدالباری آسی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، شوکت تھانوی، غلام احمد فرقت کاکوروی اور فیاض علی کے نام شامل ہیں۔ مسعود حسن رضوی کے کتب خانے سے خلیق ابراہیم خلیق بہت مستفید ہوئے۔ اس کے بعد طرحِ نو ڈالنے والے غزل گو شعراء خصوصاً حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ اپنی آپ بیتی کے سلسلے میں انہوں نے چچا عبدالرزاق اور چھرو میاں کا ذکر کیا ہے۔ اپنے اس دور میں انہوں نے علمِ نفسیات پر مباحثے کئے۔ اس کے بعد ہمیں ان جگہوں کا تذکرہ ملتا ہے جہاں جہاں خلیق صاحب گئے تھے۔ ان علاقوں میں اجمیر، الٰہ آباد، لاہور، دہلی اور بمبئی کو خصوصیت حاصل ہے لیکن خود نوشت کا یہ حصہ کچھ سفر نامے کی حیثیت رکھتا ہے۔(۱۴)

"منزلیں گرد کے مانند" میں مبالغہ آرائی کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے۔ ہم عصر سوانح نگاروں کے برعکس خلیق ابراہیم خلیق نے سنجیدگی کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ خلیق صاحب نے جو دیکھا اس کو ویسے ہی بیان کر دیا جو کہ نہایت مشکل اَمر ہے۔ انہوں نے مسلمان اور ہندو سبھی نامور ادیبوں کا تذکرہ انتہائی مہارت سے کیا ہے اور جنس کی بنیاد پر بھی تعصب نہیں برتا۔ خلیق کی تحریر میں ان تمام خصوصیات کے باوجود کہیں کہیں بوریت کا احساس بھی ہونے لگتا ہے، اس ضمن میں صفحہ نمبر ۴۱۳ سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"ازابیلا تھابرن کالج جو عرف عام میں آئی ٹی کالج کہلاتا ہے برصغیر میں لڑکیوں کی قدیم ترین درس گاہوں میں سے ہے۔ اس کے علمی ماحول، تعلیمی معیار اور حسن تربیت کا سارے برصغیر میں شہرہ تھا اور ہر صوبے سے لڑکیاں یہاں پڑھنے آتی تھیں۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں بعض نامور خواتین اسی کالج کی پڑھی ہوئی تھیں۔ اُس زمانے میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہمہ صفت موصوف طالبات کی ایک کہکشاں تھی جس کا درخشاں ستارہ قراۃ العین حیدر تھیں۔ دوسرے تابناک ستاروں میں نمایاں جسپال بہنیں شکنتلا، کملا اور بملا تھیں اور فیروز جبیں تھیں۔ یہ چاروں قراۃ العین حیدر کی عزیز ترین سہیلیوں میں شامل تھیں۔ شکنتلا جسپال نے رفیع احمد قدوائی کے بھتیجے انور جمال قدوائی سے اور فیروز جبیں نے ایک بنگالی ڈاکٹر مکرجی سے شادی کی۔ فیروز جبیں نے رتن ناتھ سرشار اور ان کے زمانے کے لکھنؤ پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، اور اب ڈاکٹر فیروز مکرجی کہلاتی ہیں۔ اردو کی ادبی دنیا میں وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اُن کا مستقل قیام لندن میں ہے"۔ (۱۵)

خلیق صاحب جس جگہ بھی رہے وہاں کی علمی و ادبی شخصیات کی مجلس میں بیٹھنے اور ان کی باتوں سے فیض یاب ہونے کے لیے کوشاں رہے۔ الٰہ آباد میں فراق گورکھپوری جبکہ لاہور میں میراجی، احمد ندیم قاسمی، امتیاز علی تاج، ن۔م۔ راشد قابلِ ذکر شخصیات ہیں۔ دہلی میں خواجہ حسن نظامی، جوش، انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، بابائے اردو، پنڈت کیفی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آخر میں ۱۹۴۵ء کے بمبئی کا ذکر ہے اور پھر اس وقت کی دستاویزی فلموں کا ذکر ہے مزید یہ کہ معلوماتی فلموں کا بھی ذکر ہے۔ اس دور کی اہم شخصیات میں ذوالفقار علی بخاری کا نام ہے۔ پاکستان کی آزادی کے سلسلے میں بحریہ بغاوت کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ خلیق صاحب نے آخر میں لکھنؤ کی فلمی شخصیات کا بھی ذکر شامل کیا ہے۔ کیفی اعظمی اور اختر الایمان سے ملاقاتوں کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ بمبئی کے قیام کے دوران فلم ان کا وسیلۂ روزگار تھا اور آپ نے کئی فلموں کی کہانیاں اور منظر نامے و مکالمے لکھے جبکہ چند اخبارات میں بھی کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے بمبئی کے اخبارات و رسائل کا بھی احاطہ اپنی اس کتاب میں کیا ہے۔ اردو اور ہندی ادب کا سرسری جائزہ بھی ہمیں ملتا ہے، آخر میں جاں نثار اختر کا بھی ذکر کرتے چلے ہیں۔(۱۶)

مجموعی طور پر جب ہم خلیق صاحب کی آپ بیتی کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کا اسلوب اور اندازِ بیان بلاشبہ قابل تعریف ہے، واقعہ نگاری بھی ہمیں اچھی مل جاتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ منظر آنکھوں کے آگے ایک فلم کی مانند چل رہا ہے۔ آپ بیتی کا مقصد محض فرد کی داستانِ حیات نہیں بلکہ ایک معاشرے کی عکاسی بھی اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ آپ بیتی قابلِ قدر ہے۔ مزید یہ کہ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں خود نمائی سے گریز کیا ہے۔ اس ضمن میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ:

"جو شخص آپ بیتی لکھے گا اس کی انتہائی کوشش طبعاًیہ ہوگی کہ وہ اپنی زندگی کے صرف وہی پہلو منظر عام پر لائے جو اس کے نزدیک شایان و زیبا ہوں۔ ان کی زیبائش و آرائش اور تزئین و تحسین میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا بلکہ مختلف برائیوں کے چہرے پر بھی حسن و خوبی کا رنگ و روغن اس طرح چڑھا دے گا کہ وہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جائیں"۔ (۱۷)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

اس اعتبار سے یہ آپ بیتی نہایت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ 'منزلیں گرد کے مانند' میں خلیق ابراہیم نے اپنی ذات کے حالات و واقعات کو مرکز بنانے کے بجائے اپنے دور کے حالات و واقعات کو توجہ کا مرکز بنایا۔ انہوں نے لکھنؤ کے حالات بیان کیے تو ایک پورا عہد بیان کر دیا۔ انہوں نے شہر کی عمومی صورت حال بیان کرتے ہوئے خواتین کے حالات سے لے کر علماء کے باہمی تعلقات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جب کہ قدیم علوم کا تذکرہ کیا تو طبِ مشرقی، یونانی و آیورویدک کو مفصل بیان کیا۔ خلیق کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنی تمام تر توجہ ارد گرد کے حالات پر مرکوز رکھتے ہوئے حقائق کو سچائی سے بیان کرتے ہیں۔

یہ ان کی زندہ دلی ہے کہ وہ اپنی ذات کو محور بنانے کی بجائے سماج کو توجہ کا محور بناتے ہیں۔ ورنہ ان کے معاصر خود نوشت نگار تو اپنی خود نمائی اور ذاتیات سے باہر نکلتے بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ خلیق صاحب نے اپنے دوستوں ہی کو نہیں بلکہ اپنے عہد کے تمام شعراء، ادیبوں اور فن کاروں کو اپنی یادداشتوں کا حصہ بنایا۔ ان کو خود نوشت پڑھنے کے بعد قاری کہیں ماضی میں نہیں کھو جاتا بلکہ وہ کھلی آنکھوں اَن دیکھی چیزوں کو اپنے سامنے ہی محسوس کرنے لگتا ہے۔ شدّھی اور سنگٹھن کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خلافت اور سوراج تحریک کے دوران ہندو مسلم اتحاد کا جو مثالی مظاہرہ دیکھنے میں آیا تھا، اس نے انگریز حکمرانوں اور متعصّب فرقہ پرستوں کے ہوش اڑا دیے تھے۔ برطانوی دورِ حکومت کی ابتدا سے ہی ایسے کاسہ لیس پنڈت اور پروہت اور نام نہاد علما و مشائخ بھی موجود تھے جو انگریز حکمرانوں کو 'مہابلی' اور 'ظل اللہ' قرار دینے لگے تھے۔ انگریز حکّام ان سے تفرقے پیدا کرنے کا کام لیتے تھے اور یہ ہندو مسلم ذہنوں کو مسموم کرنے میں لگے رہتے تھے۔ ان سب کو موقعے کی تلاش تھی کہ بھرپور وار کر کے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر سکیں"۔ (۱۸)

فلمی دنیا کی بات کرتے ہوئے خلیق ابراہیم نے اہم ترین شواہد کو تحریر کر کے انہیں تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔ جہاں اپنی فلمی سرگرمیوں کو مفصل بیان کیا ہے وہاں برصغیر کی فلمی دنیا کا تذکرہ بھی انتہائی فراخ دلی سے کیا ہے۔ تاہم انہوں نے اس ضمن میں تلخ حقائق بھی تحریر کرنے میں کوئی عار نہ محسوس کی اور جو کچھ دیکھا اس کو اسی طرح قلمبند کر دیا۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

"فلمی صنعت کے سرمایہ کاروں میں اَن پڑھ سیٹھوں کا غلبہ تھا اور فلم ساز اور ہدایت کار ان کی خوشنودی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ واقعی اچھی اور معیاری فلمیں بنانے والے کم تھے۔ جس قسم کی فلمیں لکھنے یا بنانے کی میری تمنّا تھی، اب وہ حسرت میں بدل چکی ہے۔ کچھ اچھی فلمیں یا بعض فلموں کے اچھے حصے لکھنے کا موقع ضرور ملا لیکن فنّی تخلیق کے بعد جو طمانیت اور آسودگی ملتی ہے وہ تھوڑی بہت پاکستان میں بعض دستاویزی فلمیں بنانے کے بعد حاصل ہوئی۔ بمبئی کی فلمی صنعت روزگار کا وسیلہ رہی اور بس"۔ (۱۹)

انہوں نے انڈین انفارمیشن فلم میں ۱۹۴۵ء میں اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا اور ممبئی میں سکونت اختیار کی۔ ان کے لیے یہ بات بھی قابل صد اعزاز تھی کہ کچھ عرصے تک بابائے اردو مولوی عبدالحق کے پرسنل اسسٹنٹ رہے۔ (۲۰)

اردو زبان و ادب سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ خلیق نے بمبئی کے اخبارات و رسائل میں بھی بہت مدت تک فرائض انجام دیے۔ 'میری صحافتی سرگرمیاں' کے عنوان سے جب اپنی صحافتی خدمات کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی معاشی ناہمواریاں بھی بیان کیں ان کے مطابق وہ اپنے ابتدائی دنوں میں اخبارات میں کام تو با آسانی حاصل کر لیتے تھے مگر مشاہرہ بہت کم ملتا تھا۔ تاہم اس کے باوجود کئی اخبارات و رسائل کی ادارت کے فرائض انجام بخوبی انجام دیے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس تحریک سے منسلک کون کون سے ادیبوں اور شعراء کو پابند سلاسل کیا گیا تھا۔

خلیق کی ان تمام تر خصوصیات کے باوجود اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ آپ بیتی کا ناقد جب اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اس میں کچھ فنّی خرابیاں نظر آتی ہیں اور آپ بیتی کے فن پر یہ کتاب مکمل طور پر پوری اترتی نظر نہیں آتی کیونکہ اس میں خلیق نے اپنا ذکر بہت معمولی سا کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کتاب آپ بیتی سے زیادہ سفر نامہ محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں انہوں نے خود کو تماشہ نہیں بنایا بلکہ تماش بین کی حیثیت سے اس دور کے تمام حالات کو پیش کیا ہے تاہم 'منزلیں گرد کے مانند' میں ہمیں خلیق کی زندگی کے متعلق قابل قدر معلومات کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ خلیق صاحب کی زندگی بہت سی ادبی شخصیات کے ساتھ گزری، ان شخصیات کے حوالے سے خلیق صاحب نے گراں قدر مضامین تو تحریر کیے لیکن اپنی شخصیت کو بہت کم ظاہر کیا ہے جبکہ:

"آپ بیتی کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف یا تو سب کچھ چھپا جاتا ہے یا بہت بننے کی کوشش کرتا ہے اور مبالغے سے کام لیتا ہے"۔ (۲۱)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

حواشی:

۱۔ مولانا ابرار احمد اجراوی قاسمی، ’نقشِ حیات: ادبی نگار خانے میں‘ مشمولہ: ماہنامہ دارالعلوم، (شمارہ ۱۲، جلد ۹۸)، دسمبر ۲۰۱۴ء۔

۲۔ عزیز نبیل، ’پیش لفظ‘ مشمولہ: دستاویز، مرتبہ: عزیز نبیل (کراچی: اٹلانٹس پبلی کیشنز، ۲۰۲۱، ص۸۔ بحوالہ ’آپ بیتی پر ہندوستانی جرائد کے خصوصی شماروں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ‘، جہان تحقیق، شمارہ ۴ نمبر ۴، ۲۰۲۱۔

۳۔ عارف وقار، ’خود نوشت کا فن اور ڈاکٹر پروازی‘ بی بی سی اردو ڈاٹ کام۔

۴۔ مولانا علم الدین سالک، ’آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو‘ مشمولہ: نقوش، آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغِ اردو، لاہور: جون ۱۹۶۴ء، ص ۵۴۔

۵۔ مقدمہ ’بیتی کہانی‘، شہر بانو بیگم، مرتبہ: ’ڈاکٹر معین الدین عقیل‘، مطبوعہ ۱۹۹۵ء، ادارۂ علمی، حیدر آباد، پاکستان، ص۸۔

۶۔ دی نیوز انٹر نیشنل، ۳۰ ستمبر ۲۰۰۶۔

۷۔ روزنامہ ڈان، ۳۰ ستمبر ۲۰۰۶۔

۸۔ زاہدہ حنا، ’نگاہوں سے او جھل گئے‘، روزنامہ ایکسپریس، لاہور۔ یکم اکتوبر ۲۰۰۶، ص ۱۴۔

۹۔ رفیع الزمان زبیری، ۵ / اکتوبر ۲۰۱۷ء، بحوالہ https://www.express.pk/story/954105/

۱۰۔ خلیق ابراہیم خلیق، ’منزلیں گرد کے مانند‘، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۹ء۔

۱۱۔ ایضاً ص ۴۱

۱۲۔ سرفراز، رفیعہ، ”منزلیں گرد کے مانند (خلیق ابراہیم خلیق) اک نظر میں“، بحوالہ https://www.humsub.com.pk/198645/rafia-sarfraz-3/

۱۳۔ خلیق ابراہیم خلیق، محولہ بالا۔

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ غلام رسول مہر، ’آپ بیتیوں کی اہمیت‘، مشمولہ: نقوش، محولہ بالا، ص ۳۷۔

۱۸۔ خلیق ابراہیم خلیق، محولہ بالا۔

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ https://www.pakpedia.pk/khalique-ibrahim-khalique/ تاریخ رسائی ۲۳ جنوری ۲۰۲۱ء

۲۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ’آپ بیتی‘، مشمولہ: نقوش، محولہ بالا، ص ص ۶۱ تا ۶۲۔

مآخذ:

۱۔ قومی زبان، مطبوعہ اگست ۱۹۸۸ء، کراچی۔

۲۔ نقوی،ڈاکٹر نعیم، تنقید و تفہیم، مطبوعہ ۱۹۸۴ء۔

۳۔ نقوش، آپ بیتی نمبر، مطبوعہ ۱۹۶۴ء۔ ادارہ فروغ اردو، لاہور۔

۴۔ عقیل،ڈاکٹر معین الدین (مرتب)، مقدمہ "بیتی کہانی"، شہر بانو بیگم، مطبوعہ ۱۹۹۵ءادارۂ علمی، حیدر آباد۔

۵۔ قومی زبان، مطبوعہ جنوری ۲۰۱۰ء، کراچی۔

۶۔ خلیق، ابراہیم خلیق۔ 'منزلیں گرد کے مانند'، مطبوعہ ۹۹۹۱ء فضلی سنز، کراچی۔

۷۔ قاسمی، مولاناابرار احمد اجراوی، 'نقشِ حیات: ادبی نگار خانے میں'، مشمولہ: ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ ۱۲، جلد ۹۸، دسمبر ۲۰۱۴ء۔

اخبارات:

روزنامہ ڈان کراچی ۳۰ ستمبر ۲۰۰۶۔

روزنامہ نیوز، کراچی ۳۰ ستمبر ۲۰۰۶۔